محمد اشفاق چغتائی

"اسلامی فلسفۂ زندگی" کا مختصر تنقیدی جائزہ

"اسلامی فلسفۂ زندگی" نوجوان عالمِ دین پروفیسر محمد طاہر القادری سرپرست ادارہ منہاج القرآن لاہور کی تصنیف ہے۔ پروفیسر صاحب ان دنوں "منہاج القرآن" کے نام سے قرآنِ حکیم کی لازوال حکمتوں کے بیش بہا موتی تفسیری شکل میں پیش کر رہے ہیں۔ زیرِ نظر کتاب "اسلامی فلسفۂ زندگی" میں سورۂ فاتحہ کی آیتِ کریمہ اھدنا الصراط المستقیم" کے تحت اسلامی فلسفۂ زندگی کی وضاحت کی گئی ہے۔

ماضی قریب میں اسلام کے فکری نظام کے خلاف اس قدر زہریلا پروپیگنڈا کیا گیا کہ دنیائے فکر و نظر میں اسلام کو ایک عظیم تحریک کی بجائے دھرم کی منجمد شاستر سمجھا جانے لگا۔ حکیم الامّت علامہ اقبال اور دیگر حضرات نے اس خطرناک سازش کو بھانپ کر اس کے خلاف آواز بلند کی اور اسلام کو ایک زندہ قوت اور متحرک دین ثابت کرنے کے لیے اپنی صلاحیتیں صرف کر دیں۔ انھوں نے مسلمانوں کو اسلامی انقلابی فکر اور شعورِ مقصد عطا کرنے کی کوشش کی اور انھیں خبردار کیا کہ:

دینِ بے قوت ہمہ مکر و فسوں!

ضرورت اس بات کی تھی کہ مفکرینِ ملت کی ان آوازوں کو حیات آفریں دعوتِ عمل کی صورت میں برقرار رکھا جاتا اور انھیں عقل و دانش کی غذا فراہم کی جاتی، مگر ہمارے ہاں اس نہج پر بہت زیادہ کام نہ ہو سکا۔ مقامِ مسرت ہے کہ اب دنیائے تصنیف و تالیف میں ایسی مستحسن کوشش شروع ہو گئی ہیں۔ پروفیسر محمد طاہر القادری صاحب کی زیرِ نظر تصنیف اسی سلسلے کی ایک زریں کڑی ہے۔ موصوف نے وقت کے اصل مرض کی صحیح تشخیص کی ہے اور اپنی فکر کے مطابق اسلام سے اس کا علاج تجویز کیا ہے۔

موجودہ دور سرمایہ و محنت کا دور ہے، اب عالمی سطح پر جاگیرداری اپنی بساط لپیٹ چکی ہے اور معیشت و اقتصاد کے معبدوں میں سجے ہوئے سرمایہ داری کے بت اشتراکیت کی زلزلہ انگیزیوں سے لرزہ براندام ہیں۔ اس وقت دنیا راہِ نجات کی تلاش میں ایک دوراہے پر کھڑی ہے اور سوچ

رہی ہے کہ سامراج کے قدموں میں گر جائے یا اشتراکی آمریت کا طوق زیب گلو کر لے۔ اس وقت دنیا کو یہ بتانا کہ "ان دو نظام ہائے معیشت کے علاوہ ایک تیسرا نظام بھی ہے جو انسانوں کو فردوسِ مقصود سے ہم کنار کرتا ہے"۔ فی الواقع بہت بڑا کام ہے لیکن یہ کام کھوکھلے نعروں سے نہیں کیا جا سکتا۔ اسلام کو بہترین نظامِ زندگی اور اکمل ضابطۂ حیات ثابت کرنے کے لیے ایسے لٹریچر سے بھری الماریاں کام نہیں آ سکتیں جن میں اشتراکیت کی مخالفت کرتے ہوئے اسلام کو سرمایہ دارانہ نظام کا سرپرست بنا کر پیش کیا گیا ہو اور نہ ہی ایسے دفاتر کام آ سکتے ہیں جو سرمایہ داری کی مخالفت میں اتنے آگے بڑھ جائیں کہ انھیں اشتراکیت ہی کا مثنیٰ (Duplicate) سمجھا جائے۔ اس وقت تو اسلام کے ایسے مطالعے کو برسرِ عام لانا اصل کام ہے جو اسے ان دونوں نظام ہائے معیشت سے ممیز و ممتاز کر سکے۔

زیرِ نظر کتاب "اسلامی فلسفۂ زندگی" میں فاضل مصنف نے ایسی ہی کوشش فرمائی ہے اور ہر قدم پر ان کا نقطۂ نظر اصل، بے میل اور خالص اسلام کو پیش کرنا رہا ہے۔ پروفیسر صاحب کے نزدیک معاشی ناہمواریوں کا پیدا کردہ کرب ہی ہے جس نے ہمیشہ سے دنیا کو اضطرابِ پیہم کا جہنم زار بنا رکھا ہے، اور یہ کوئی ایسی بیماری نہیں جو آج ہی پیدا ہوئی ہو اور آج ہم خود ہی اس کا علاج تجویز کرنے بیٹھ جائیں۔

پروفیسر صاحب نے بجا طور پر یہ سمجھا ہے کہ یہ مرضِ پارینہ آغازِ اسلام میں بھی معاشرے کو لاحق تھا اس لیے اس کا علاج بھی وہی ہونا چاہیے جو خود طبیبِ کائنات، شافیِ مطلق نے اپنے نسخۂ شفا میں تجویز فرمایا تھا:

وہی دیرینہ بیماری وہی نامحکمی دل کی — علاج اس کا وہی آبِ نشاط انگیز ہے ساقی!

فاضل مصنف نے اپنی تصنیف میں اسی نسخۂ شفا سے ہدایت لینے کی کوشش کی ہے اور انسانی تاریخ کے مرضِ کہن کا علاج بھی وہی "آبِ نشاط انگیز" تجویز فرمایا ہے۔ لیکن اگر اجازت ہو تو نہایت ادب سے یہ عرض کرنے کی جسارت کروں کہ بعض نکات ایک خلجان کا موجب بن رہے ہیں، اگر ان کی مزید وضاحت ہو جاتی تو شاید ذہنوں میں خلش باقی نہ رہتی۔

اسلامی فلسفۂ زندگی میں رضائے الٰہی کا حصول انسانی زندگی کا نصب العین قرار دیا گیا ہے اور فعلِ احسان کو حصولِ نصب العین کا طریقِ کار بتایا گیا ہے، اور انفاق فی المال کو اس طریقِ کار کی

عملی اساس قرار دیا گیا ہے۔

انفاق فی المال قرآن کا حکم ہے اور حکم بھی ایسا کہ بقول پروفیسر صاحب یہ "دین کا وجوبی ضابطہ ہے" (اسلامی فلسفۂ زندگی ص ۸۹) اور اسی انفاق کے متعلق ان کا یہ اعلان ہے کہ "انفاق فی المال ہی حقیقت میں تصدیقِ دین اور اس کا ترک تکذیبِ دین ہے" (ص ۹۰)۔ یہی انفاق فی المال ہے جسے وہ آیۂ کریمہ "ان اللہ یامرکم بالعدل والاحسان" میں فعل احسان کا محمل اور اس کی عملی اساس قرار دیتے ہیں اور پھر اسے فرضِ عین ٹھہراتے ہیں۔ "لہٰذا احسان کا یہ مفہوم اہلِ ایمان کے لیے درجۂ فرضِ عین ہے" (ص ۵۰) ایسے فرض و واجب کے متعلق دوسری جگہ نفل کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اور احسان کو انفاق نافلہ میں شمار کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: "یہاں یہ امر ذہن نشین رہے کہ فعلِ احسان کا اطلاق انفاقِ واجبہ پر نہیں بلکہ انفاق نافلہ پر ہوگا۔ انفاقِ واجبہ کی تمام صورتیں قرآن کے حکم عدل کے تحت شمار کی جائیں گی کیوں کہ عدل کا مفہوم یہی ہے کہ جس قدر دینا لازم ہو اسی قدر دیا جائے اور شرعاً واجب حصے کے علاوہ دینا احسان ہے" (ص ۶۷)

اس عبارت میں انفاق یا احسان کو فرض و واجب کی بجائے نفل شمار کیا گیا ہے اور نفل فقہا کے نزدیک وہ بات ہوتی ہے جس کے کرنے والے کو ثواب ملے، مگر نارک پر کسی قسم کا گناہ نہ ہو۔ گویا فعلِ احسان، جسے انفاقِ نافلہ کے زمرے میں شمار کیا گیا ہے، کا نارک کسی گناہ کا مرتکب نہیں ہوتا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ فعلِ احسان تو فرضِ عین کے درجے میں تھا اور اس کا ترک تکذیبِ دین کے مترادف تھا تو اب وہ محض نفل کیسے ہوگیا۔

پروفیسر صاحب کے بقول اسلام ایک ایسا معاشرہ قائم کرنا چاہتا ہے جس میں "اگر معاشرے کے کچھ لوگ بنیادی ضروریات سے محروم ہوں اور صاحبِ دولت تعیشات کی زندگی بسر کرتا ہے تو یہ عدل کے خلاف ہے۔ یعنی جو سہولتیں وہ خود کو مہیا کرنا چاہتا ہے، دوسروں کے لیے بھی ان ہی کا خیال رکھے۔ اگر یہ احساس اور درد دل و دماغ میں مفقود ہو اور عمل ان خصائص سے عاری ہو تو زندگی خلافِ عدل ہوگی، کیوں کہ[1] خلافِ عدل کو ظلم کہتے ہیں اور ظلم منافیِ ایمان ہے۔ اس صورت

---

[1] چونکہ کی بجائے کیوں کہ غالباً کتابت کی غلطی ہے۔

میں یہ سمجھنا چاہیے کہ ایمان کا ادنیٰ تقاضا بھی پورا نہیں ہو رہا۔ (ص ۵۱)

اس عبارت سے یہ وضاحت ہوتی ہے کہ اسلام مکمل مساوات پر مبنی معاشرے کی تخلیق چاہتا ہے، اور یہ ایمان کا ادنیٰ تقاضا ہے، وگرنہ ہر فردِ معاشرہ کو اس ایثار کا پیکر ہونا چاہیے کہ "میرا دوسرا بھائی مجھ سے بلند معیارِ زندگی کا حامل ہو" اور ہر مسلمان اپنی خوشیاں دوسرے مسلمان بھائی کے لیے قربان کرنے والا ہو۔ ابنِ جریر نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا یہ قول نقل کر کے تاریخ پر کتنا بڑا احسان کیا ہے کہ: "مجھ میں اور رومۃ الکبریٰ کے بادشاہوں میں یہی فرق ہے کہ وہ لوگوں کی گردنوں پر اپنا تخت بچھاتے اور خود اس پر سوار ہو جاتے ہیں۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ لوگ اپنا تخت میری گردن پر رکھیں اور خود اس پہ بیٹھ جائیں۔ (ابن جریر طبری ج ۳ مناقب ابی بکر) اور تاریخ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے اس قول کو بھی آج تک بجا طور پر اپنی متاعِ بیش بہا سمجھ رہی ہے، جس کے مطابق انھوں نے اپنے نانِ جویں کھانے پر اظہارِ تعجب کرنے والے کو یہ کہہ کر لاجواب کر دیا تھا کہ: "جب تک تمام مسلمانوں کو گندم کی روٹی اور زیتون کا تیل میسر نہ ہوں میں یہ چیزیں نہیں کھا سکتا۔" (ترمذی باب مناقب عمرؓ)

جب خلفائے راشدین کے نزدیک بھی ایمان کی میزان یہی عملِ حسن ٹھہرے تو پھر یقیناً یہ کہنا بجا ہے کہ عام مسلمان اگر دوسرے مسلمان بھائیوں کی ضروریات سے غافل ہو کر عیش و تنعم کی زندگی بسر کر رہا ہو تو وہ ادنیٰ درجے کے ایمان کا بھی حامل نہیں ہو سکتا۔ پھر حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمانِ گرامی بھی ہمارے سامنے رہے کہ "جس کا پڑوسی رات بھر بھوکا سویا اور اس نے پیٹ بھر کر کھانا کھایا، وہ مجھ پر ایمان نہیں لایا" اور شرعی توضیحات کے مطابق جب لفظ پڑوسی چاروں سمتوں میں چالیس چالیس گھروں کو محیط ہوتا چلا جائے تو پھر افلاس کا نشان کہاں باقی رہے گا؟ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم اس شخص کو خارج از ایمان قرار دیتے ہیں جو انفاق کا عملِ حسن سرانجام نہیں دیتا ـــ ان توضیحات کے پیشِ نظر انفاق اور فعلِ احسان کو عبادتِ نافلہ قرار دینا اس عملِ حسن کے تارک کے لیے جوازِ ایمان فراہم کرنے کے مترادف ہے۔

فاضل مصنف نے حضرت عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ کی بیان کردہ یہ روایت بھی درج کی ہے کہ "آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا بنی آدم کے لیے سوائے تین چیزوں کے اور کوئی حق نہیں۔

ایک گھر جس میں رہ سکے اور کپڑا جس سے اس کا ستر چھپ جائے اور ایک وقت کا کھانا پانی"۔ (جامع ترمذی) اور پھر اس روایت سے یہ قابلِ قدر نتیجہ بھی اخذ کرتے ہیں کہ "اگر کسی شخص کو یہ تینوں چیزیں حاصل ہوں اور اسی معاشرے کے بعض دیگر افراد ان سے بھی محروم ہوں تو کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ ان سے زائد اپنے پاس رکھے"۔ (ص ۱۱۳) ان عبارات کے مطالعے سے یہ امید پیدا ہونے لگتی ہے کہ پروفیسر صاحب ایک ایسے معاشرے کی تشکیل اسلام کا بنیادی تقاضا قرار دے رہے ہیں جس میں حاجت مندوں کے حق کا تعین ہو جائے گا، اس طرح وہ قرآنِ حکیم کی ترجمانی کرتے نظر آتے ہیں۔ و فی اموالھم حق للسائل والمحروم (اور ان کے مالوں میں سائل اور محروم کا حق ہے) گویا دولت مندوں کے اموال میں "سائل و محروم" کا اس قدر حق ہے کہ وہ ان کی ضرورت سے زائد ان سے وصول کر لیں۔ دوسری جگہ قرآنِ حکیم ہی سے اس کی تائید یوں فرمائی گئی ہے۔ یسئلونک ماذا ینفقون قل العفو۔ (اے نبیؐ وہ آپ سے پوچھتے ہیں کیا انفاق کریں، فرما دیجیے کہ جو ضرورت سے زائد ہو)۔

یہ انقلابی تعلیمات فی الواقع ایک متوازن اور منفرد معاشی نظام کی حامل ہیں، مگر اسے کیا کہیے کہ ایسی خوب صورت اور انقلابی تجاویز پیش کرنے والے فاضل مصنف یوں بھی رقم طراز ہوتے ہیں کہ "احسان میں چوں کہ دوسرے شخص کے استحقاق کا قانونی تعین نہیں ہوتا اس لیے اس پر کوئی حد نہیں ہوتی"۔ (ص ۶۷)

اگر ان واضح احکام کے بعد بھی سائل و محروم کے حق کا قانونی تعین نہیں ہوا تو ہم اس کے سوا اور کیا کہہ سکتے ہیں کہ پروفیسر صاحب اپنی حکمت و دانش کے باوجود ان لکیروں سے آگے نہیں نکل پائے جو ان سے پہلے وہ فقہا کھینچ گئے ہیں جن میں سے اکثر ملوکیت اور سرمایہ داری کے تحفظ کے فرائض سرانجام دینے پر مجبور تھے۔

میری اس تحریر کو معاندانہ تبصرے پر محمول نہ کیا جائے، میں نے احقاقِ حق کے لیے صرف چند اشارات پر اکتفا کیا ہے۔ میں صرف چند اشکالات کی وضاحت چاہتا ہوں۔ میں نے ان فقہا کے بھی خلاف نہیں جن سے ان کی مجبوریوں نے نادانستہ کچھ لغزشیں کرائیں۔ میں ان کی خدماتِ جلیلہ کا پوری طرح معترف ہوں

بندۂ ہمتِ اسلافم و آن سفلہ نیم   کہ خورم نمک و باز نمکداں شکنم   (میرزا صائبؒ)

سید جمال الدین افغانی : حیات و افکار

از شاہد حسین رزاقی

سید جمال الدین افغانی کا شمار ان چند نادرۂ روزگار افراد میں ہوتا ہے جو مشرق و مغرب کے ذہنی افکار کے رمز شناس تھے اور جنھوں نے دنیائے اسلام کے مسلمانوں میں ملی بیداری، سیاسی شعور اور قومی آزادی کا جذبہ پیدا کرنے کے لیے ازحد جد و جہد کی ۔ افغانی کے بارے میں یہ کہنا چاہیے کہ وہ اپنی مسلسل مساعی کی بنا پر عالمِ اسلام کی نشاۃِ جدیدہ کے صحیح معنوں میں معمار تھے ۔ ان کا زمانہ مغربی استعمار کے عروج اور اسلامی دنیا کے زوال کا زمانہ تھا اور اس کا انھیں انتہائی قلق تھا جو انھیں کہیں چین نہیں لینے دیتا تھا ۔
اس کتاب میں ان کی سعی و کوشش اور تگ و تاز کی تفصیلات خاص ترتیب اور عمدہ انداز سے بیان کی گئی ہیں ۔

صفحات ۸ + ۲۰۸ قیمت ۲۵ روپے

سطعات

شاہ ولی اللہ ترجمہ : سید محمد متین ہاشمی

حضرت شاہ ولی اللہ نہ صرف برصغیر پاک و ہند کی عظیم شخصیت تھے بلکہ اپنے دور میں عالمِ اسلام کی ایک نہایت قابلِ فخر اور بلند مرتبت ہستی تھے ۔ وہ بہترین مصلح ، بہت بڑے مصنف، اونچے درجے کے عالمِ دین ، بے مثال مفسر، محدث اور فقیہ تھے ۔ ان کی تصنیفات اہلِ علم کے لیے مشعلِ راہ کی حیثیت رکھتی ہیں ۔ شاہ صاحب کی گراں قدر تصنیفات میں " سطعات " کو بڑی اہمیت حاصل ہے ۔ اس کے اردو ترجمے کی شدید ضرورت تھی ۔ چنانچہ ادارہ ثقافتِ اسلامیہ یہ سعادت حاصل کر رہا ہے ۔

فاضل مترجم نے حل طلب مقامات پر حواشی بھی تحریر کیے ہیں، نیز ایک جامع مقدمہ بھی لکھا ہے جس میں شاہ صاحب اور ان کے خاندان کے حالات اور ان کی خدمات کا ذکر کیا گیا ہے ۔

صفحات ۱۹۲ قیمت ۱۸ روپے

ملنے کا پتا : ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ ، کلب روڈ، لاہور